خلافتِ ارض اور مسلم حکومتوں کے فرائض

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے ایک بنیادی اقدام

از جناب مولوی شہاب الدین صاحب ندوی ناظم فرقانیہ اکیڈیمی۔ بنگلور نمبر ۵

(۲)

خلافتِ اسلامیہ اور عالمِ اسلام کا اتحاد:

علامہ ابن خلدون (۷۳۲ ـ ۸۰۸ھ، ۱۳۳۱ ـ ۱۴۰۶ء) نے اپنی تاریخ کے مقدمے میں عربوں کے مزاج کا تجزیہ کرتے ہوئے بڑی گہری حقیقت کا انکشاف فرمایا ہے اور اس کا علاج بھی بتا دیا ہے جو ان کے کمال بصیرت اور دوربینی کا آئینہ دار ہے۔

"عربوں کو حکومت و سلطنت یا تو دینی چھاپ کے ذریعے حاصل ہوسکتی ہے یا نبوت و ولایت یا دین کے کسی بہت بڑے اثر کی بدولت۔ کیونکہ ان کی فطرت ایسی سخت، غیور اور خوددار قسم کی واقع ہوئی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی اطاعت سے دیگر قوموں کی بہ نسبت سخت متوحش ہو جاتے ہیں اور ان کی خواہشات کا (کسی ایک پلیٹ فارم پر) جمع ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا دین جب نبوت یا ولایت (دینی سیادت) کے ذریعہ اُن کے لیے سدِ راہ بن جائے تو اُن میں (اپنی ذاتی) بڑائی اور برتری کے جذبات سرد پڑ جائیں گے، اطاعت شعاری اور باہمی ملاپ اُن کے لیے آسان ہو جائے گا۔[۱]

---

[۱] ملخص از مقدمہ ابن خلدون، ص ۸۳، المطبعۃ الخیریۃ، مصر، ۱۳۲۲ھ (فصل فی ان العرب لا یحصل لھم الملک الا بصبغۃ دینیۃ من نبوۃ أو ولایۃ أو أثر عظیم من الدین علی الجملۃ۔)

اسلام کے خلیفۂ دوم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (شہادت : ۲۳ھ مطابق ۶۴۴ء) نے بڑی سچی بات بیان فرمائی ہے جو دنیا کے تمام مسلمانوں کو اپنی گرہ میں باندھ لینا چاہیے:

نحن قوم اعزنا اللّٰہ بالاسلام، وان ابتغینا العزۃ بغیرہ اذلنا اللّٰہ۔[1]

ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کو اللہ نے اسلام کے ذریعہ عزت بخشی ہے۔ (لہٰذا) اگر ہم نے عزت و بڑائی کو اسلام کے علاوہ کسی اور چیز میں تلاش کیا تو اللہ ہم کو ذلیل کردے گا۔

اس حقیقتِ واقعہ کی صداقت موجودہ دور میں خصوصیت کے ساتھ عرب اسرائیل جنگوں کی شکل میں ہمارے سامنے آچکی ہے، جب کہ بعض عرب ممالک نے مصر کے سابق صدر جمال عبدالناصر (۱۹۱۸ — ۱۹۷۰ء) کی سرکردگی میں عرب قومیت کا صور پھونکتے ہوئے عالم عرب کو عالم اسلام سے کاٹ کر بالکل الگ کر دینا چاہا تو نہ صرف خود ذلیل و رسوا ہوئے بلکہ پورے عالم اسلام کو بھی ذلیل و رسوا کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ پوری دنیا کے مسلمانوں کو متحد کرنے اور انھیں ایک لڑی میں پرو کر ہر قسم کے ذہنی و فکری اور قومی و علاقائی انتشار اور عصبیتوں سے محفوظ رکھنے کا واحد ذریعہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اسلام ہی میں وہ حیرت انگیز کشش اور جاذبیت موجود ہے جو دنیا بھر کی تمام قوموں اور فرقوں کو حقیقی اور پائیدار بنیادوں پر ایک جھنڈے تلے جمع کر سکتی ہے۔ اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا نعرہ انھیں قطعاً متاثر نہیں کر سکتا اور ہرگز انھیں ایک پلیٹ فارم پر جمع نہیں کر سکتا۔ یا اگر کسی وقتی جذبے کے تحت کچھ عارضی اتحاد ہو بھی جائے تو وہ پائیدار نہیں ہو سکتا۔

جیسا کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے: اس وقت پورے عالم اسلام کی قیادت — اپنے چند ذاتی خصائص کی بنا پر — عالم عربی ہی کر سکتا ہے جس طرح کہ اس

---

[1] البدایۃ والنہایۃ، ابن کثیر۔

اب سے چودہ سو سال پہلے کی تھی۔ بشرطیکہ وہ اپنی قدر و قیمت پہچان لے۔

چھٹی صدی عیسوی میں دنیا ایک دوراہے پر کھڑی تھی۔ اس وقت دو ہی راستے تھے:۔ یا یورپ کے لوگ اپنے جان و مال کو خطرے میں ڈال کر آگے بڑھ جاتے اور دنیا کی ترغیبات سے منہ موڑ کر اجتماعی مصلحت کی راہ میں اپنا سارا سرمایہ قربان کر دیتے، جب دنیا کو سعادت نصیب ہوتی۔ یا پھر وہ اپنی خواہشات اور مرغوبات کو انسانیت کی سعادت و فلاح پر ترجیح دیتے تو ایسی صورت میں دنیا گمراہی و بدبختی کے دلدل میں پھنسی رہ جاتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو انسانیت کی بھلائی منظور تھی اس لیے عربوں میں اس نے ولولہ پیدا کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اندر ایمان و ایثار کی روح پھونک دی تو انھوں نے اپنے آپ کو انسانیت پر قربان کرنے کے لیے پیش کر دیا۔

آج دنیا ہٹ ہٹا کر پھر اسی نقطے پر پہنچ گئی ہے جس پر وہ چھٹی صدی مسیحی میں تھی یہ عالم پھر اسی دوراہے پر نظر آرہا ہے جس دوراہے پر رسول اللہ صلعم کی بعثت کے وقت تھا۔ آج اس کی ضرورت ہے کہ عرب قوم (جس کو رسول اللہ صلعم سے تعلق خاص ہے) میدان میں نکل آئے اور پھر دنیا کی قسمت بدلنے کے لیے جان کی بازی لگائے اور اپنی تمام آسائش و ثروت اور سامان راحت کو خطرے میں ڈال دے، تاکہ دنیا اس مصیبت سے نجات پائے جس میں وہ مبتلا ہے اور زمین کا نقشہ بدل جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ عرب بدستور اپنے حقیر اغراض اور ذاتی سربلندی کی فکر میں رہیں اور سامان عیش کی فراہمی میں مشغول رہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا اسی زہریلے تالاب میں غرق زدہ رہے گی جس میں وہ صدیوں سے ہلاک ہو رہی ہے۔"[1]

---

[1] ماخوذ از انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، ص ۳۴۵ - ۳۴۷، چھٹا ایڈیشن۔

اس طرح آج علماء پر بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اور ان کا کوئی بھی غلط قدم عالمگیر پیمانہ پر تباہ کن نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس وقت نہ صرف عالم اسلام بلکہ پورا عالم انسانی سخت جانکنی اور نزع کے عالم میں ہے۔ لہٰذا ہماری ملت کے ناخداؤں کا فرض عین ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریاں کو صحیح طور پر سمجھیں اور ان کو صحیح طور پر ادا کرنے کی کوشش کریں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس قیادت کو عملاً بروئے کار لانے کی کیا شکل ہو اور عالم اسلام کس طرح اور کن خطوط پر متحد ہو سکے گا؟ یہ بڑے اہم اور نازک سوالات ہیں جو ہمارے قائدین اور ارباب دانش کے لیے ایک لمحۂ فکریہ فراہم کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان بنیادی مسائل کے حل کے بعد ہی کوئی مناسب قدم اٹھایا جا سکے گا۔

اس سلسلے میں اگر عرب اور غیر عرب ممالک کے موجودہ باہمی اختلافات کا جائزہ لیا جائے تو بڑی مایوسی ہوتی ہے اور یقین نہیں آتا کہ یہ کبھی کسی بات پر متفق بھی ہو سکیں گے مگر اسلام میں چونکہ مایوسی نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات سے یقین ہے کہ وہ ایسے حالات ضرور پیدا کر سکتا ہے جس کے نتیجے میں ایک عالمی مسلم اتحاد کے لیے فضا سازگار ہو جائے۔

بہر حال اس وقت سب سے زیادہ اہم اور اہم ترین مسئلہ جو دنیائے اسلام کو درپیش ہے وہ ہے دنیائے اسلام کا اتحاد۔ اگر یہ مشکل اور نازک مسئلہ حل ہو جائے تو پھر ہمارے تمام مسائل چٹکیوں میں حل ہو سکتے ہیں اور اسلام کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ لہٰذا ہمارے مفکرین کو اس راہ میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کر دینے کی ضرورت ہے۔ اگر خلوص اور عزم راسخ کے ساتھ جد و جہد کی جائے تو یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔

راقم سطور کے ناقص خیال میں اس مسئلے کا بہترین حل یہ ہے کہ "خلافت اسلامیہ" کے فراموش کردہ تصور کو دوبارہ زندہ کیا جائے، جس کو دنیا کے تمام مسلمانوں کی نظر میں دینی اعتبار سے ایک تقدس کا درجہ حاصل تھا۔ پوری دنیائے اسلام کا ایک "خلیفۃ المسلمین" ہو جس کے جھنڈے تلے تمام مسلم ممالک وفاقی (FEDRAL) حیثیت سے جمع ہو جائیں۔

اس مقصدِ عظیم کا حصول بادی النظر میں بہت مشکل بلکہ ناممکن دکھائی دیتا ہے۔ مگر اس مقصد کے حصول کے لیے بتدریج اور مسلسل کوشش کی جانی چاہیے۔ اول اول چند ہم خیال ممالک مل کر اس کا تجزیہ کر کے دیکھیں۔ جب اس میں کامیابی نظر آئے ـــــ اور اگر خلوص اور فکرمندی کے ساتھ ایک آئیڈیالوجی کے تحت کام کیا جائے تو انشاء اللہ ضرور کامیابی نظر آئے گی ـــــ تو پھر دیگر ممالک کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی جائے۔ بلکہ اگر یہ تجربہ شروع کر دیا جائے تو دیگر ممالک کے عوام خود اپنی حکومتوں سے اس دفاق میں شرکت کا تقاضہ شروع کر دیں گے اور اس طرح یہ ایک عوامی تحریک بن جائے گی۔

اگر اس قسم کے دفاق کو وجود میں لانا فی الحال ممکن نہ ہو تو پھر ایک ڈھیلی ڈھالی یونین اور ایک مشترکہ سیکرٹریٹ قائم کر کے عالم اسلام کو کسی نہ کسی حیثیت سے ایک مرکزیت عطا کی جائے، کیونکہ وہ آج بے مرکز اور بے منبر و محراب ہے۔ اور آج روئے زمین پر چالیس سے زیادہ مسلم ممالک موجود ہونے کے باوجود ان میں کسی قسم کا تال میل نہیں ہے اور ہر ایک اپنی بولی الگ الگ بول رہا ہے۔

غرض یہ وہ صدا ہے جس کے لیے ساری اسلامی دنیا کا دل دھڑک رہا ہے اور سب کی نگاہیں قدرتی طور پر عالم عربی پر مرکوز ہیں۔ یہ عالم عربی کے لیے ایک بہت بڑا امتحان اور آزمائش ہے۔ اور خدا کرے کہ وہ اپنی اس آزمائش میں پورا اُترے۔

"خلافتِ اسلامیہ" کا یہ اصطلاحی مفہوم اور اس کا تصور بھی دراصل وسیع تر "خلافت ارض" ہی کا ایک جزو اور اُس کا ایک حصہ ہے۔ اگر ہم "خلافت اسلامیہ" قائم نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم وسیع تر خلافت ارض کے لیے بھی نااہل ہیں، جو خدا کے نزدیک مطلوب و مقصود ہے۔ خلافت ارض کے قیام کے لیے سب سے پہلے خلافت اسلامیہ کا قیام ضروری ہے اور یہ خداوند کریم کی جانب سے ہمارا بہت بڑا ابتلاء ہے۔ لہٰذا ہمیں اس راہ میں ہر قسم کی قربانیاں دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

یہ ملت اسلامیہ کی بد قسمتی تھی کہ ترکی کے مصطفیٰ کمال پاشا (۱۸۸۱ء - ۱۹۳۸ء) نے یورپ کے اتحادیوں اور خاص کر انگریزوں کے اشارے پر[1] خلافت اسلامیہ کو ۳ مارچ ۱۹۲۴ء میں[2] ختم کر کے وحدت اسلامی کو پارہ پارہ کر دیا۔ اور اپنی سادہ لوحی کے باعث استعماریت (COLONIALISM) کی خدمت کی اور اسلام کو ایسا ناقابل تلافی نقصان پہنچایا کہ ملت اسلامیہ اب تک اپنے زخموں کو چاٹ رہی ہے۔ حکیم مشرق علامہ اقبال نے اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

حقیقت یہ ہے کہ ایک مرکزی خلافت کے قیام کے باعث دنیا بھر کے مسلمانوں کو اس سے ایک جذباتی تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ۱۹۲۴ء سے پہلے کے واقعات شاہد ہیں کہ جب انگریزوں نے ترکی خلافت کو ختم کر کے اُس کے حصے بخرے کرنے کا منصوبہ بنایا تو ہندوستانی مسلمانوں پر اس کا شدید ردّ عمل ہوا۔ اور ترکی کی خلافت کو (جو اُس وقت پورے عالم اسلام کی مرکزی خلافت سمجھی جاتی تھی اور اس کو ایک طرح سے مذہبی تقدس کا درجہ حاصل تھا) بچانے کے لیے مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸ء - ۱۹۳۱ء) کی قیادت میں جو زبردست تحریک چلائی گئی وہ تاریخ میں تحریک خلافت کے نام سے مشہور ہے۔ اُس وقت ہندوستانی مسلمانوں نے ـــــ اپنے غلام ہونے کے باوجود ـــــ جس اسلامی جذبے اور جوش کا مظاہرہ کیا وہ دنیا والوں کے لیے باعث حیرت و استعجاب اور ایک مثالی نمونہ تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کسی نے اُن کے سینوں میں آگ لگا دی ہے۔ اور ان کے جذبات و احساسات اور ان کے شدید ردّ عمل

---

[1] ملاحظہ ہو ماہنامہ "جامعہ" کے مولانا محمد علی نمبر میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مضمون ص ۲۶، اپریل ۱۹۷۹ء، نیز مولانا موصوف کی کتاب پرانے چراغ، حصہ دوم، ص ۱۷۔

[2] انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم، مترجمہ غلام رسول مہر، ۱/۲۰۷، لاہور، ۱۹۶۸ء۔

ہے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ انگریز ترکی سے نہیں بلکہ ہندوستانی مسلمانوں سے لڑ رہے ہیں۔ اس موقع پر ہندوستانی مسلمانوں نے جو قربانیاں دی ہیں وہ تاریخ کے صفحات میں زندہ اور یادگار رہیں گی۔ یہ کیا چیز تھی۔ اور کس چیز نے انھیں اس حیرت انگیز جذبہ اور شدید ردّعمل پر ابھارا ہو گیا یہاں پر دینی و مذہبی جذبے کے علاوہ کوئی دوسری چیز بھی نظر آتی ہے؟ حالانکہ ترکی اور ہندوستان کی سرحدیں ملی ہوئی نہیں ہیں۔ اور ان دونوں میں قومیت، زبان، تہذیب و معاشرت وغیرہ ہر چیز میں نمایاں تفاوت نظر آتا ہے۔ یہ تاریخ کی ناقابلِ انکار حقیقت و شہادت ہے۔ اور آج بھی برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں میں بلکہ سارے جہان کے مسلمانوں میں یہی جذبات موجزن ہیں اور وقت پڑنے پر وہ ہر قسم کی قربانیاں دے سکتے ہیں۔

غرض "خلافتِ اسلامیہ" مسلمانوں کے دل کی آواز اور ایک ارب کلمہ گویان کے دلوں کی دھڑکن بن سکتی ہے، بشرطیکہ صحیح خطوط پر کام کیا جائے اور صحیح طریقے پر انھیں منظم کیا جائے۔ وہ اس وقت بے قاعدہ اور بے چرواہے کی بکریوں کی طرح اِدھر اُدھر منتشر اور بکھرے ہوئے ہیں۔

"خلیفۃ المسلمین" جس کو بنایا جائے وہ خدا کے احکام کو نافذ کرنے اور دنیا کے تمام مسلمانوں کی بہبودی کو مدِنظر رکھنے والا ہونا چاہیے۔ اس لحاظ سے اُس کے تمام احکام ——— اسلامی قانون کے حدود میں ——— سب کے لیے واجب الاطاعت ہوں گے۔

ابھی ماضی قریب میں عالم اسلام کو متفق و متحد کرنے کی ایک بہت بڑی کوشش شروع ہو چکی تھی، جس کے داعی و محرک ملیشیا کے سابق وزیرِ اعظم تنکو عبدالرحمان تھے۔ افسوس کہ یہ کوشش بارآور نہ ہو سکی اور جذبات پھر سرد ہو گئے۔ یہ کوشش از سرِ نو شروع ہونی چاہیے اور اس کو ہر قیمت پر پایۂ تکمیل کو پہنچایا جائے۔ اگر اس راہ میں پچیس پچاس سال بھی صرف ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ ضرورت صرف مستقل مزاجی اور فولادی عزم کے ساتھ کام کرنے کی ہے اور اس راہ میں چند مخلص اور بے لوث آدمیوں کو اپنی زندگیاں وقف کر دینی چاہییں۔

کیونکہ اس قسم کے نتائج راتوں رات برآمد نہیں ہو سکتے۔ ذہن سازی اور قوموں کی تعمیر بہت مشکل، صبر آزما اور پتہ ماری کا کام ہے مگر ناممکن اور محال نہیں ہے، جیسا کہ مختلف قوموں اور اُن کے عروج و زوال کے احوال و کوائف کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے۔ منظم منصوبہ اور مسلسل عمل یہ دو چیزیں کامیابی کی ضمانت بن سکتی ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا وسیع تر کارِ خلافت کے پیش نظر ابتداءً اگر صرف چند ہم خیال ممالک بھی متحد ہو کر محدود پیمانے پر ہی سہی خلافتِ اسلامیہ کا تجربہ کریں تو اس عمل کے ظہور میں حیرت انگیز نتائج کے نکلنے کی توقع ہے ان کے ظہور کے بعد مزید ممالک کو بھی اس بلاک میں شامل ہونے کی ترغیب مل سکتی ہے۔ پھر اس کے بعد دیگر ممالک بھی بتدریج برضا و رغبت اس میں شامل ہو سکیں گے۔ صحیح خطوط پر کام شروع کرنے کے لیے یہ ایک صحیح نقطۂ آغاز ہوگا۔

دنیائے اسلام میں رونما ہونے والے چند جدید ترین واقعات اور خصوصاً مسلم افغانستان پر روس کی فوج کشی اور یلغار نے مسلم ممالک کی آنکھیں کھول دینے اور اپنے تمام باہمی اختلافات کو فراموش کر کے متحد ہو جانے کا ایک نادر موقع فراہم کر دیا ہے۔ اگر اب بھی تمام مسلم ممالک ایک نہیں ہو جاتے تو پھر اغیار کی ہوسناکیوں کی بھینٹ چڑھنے اور ان کا لقمۂ تر بننے کے لیے انھیں تیار رہنا چاہیے۔

اگر تمام مسلم ممالک ایک جھنڈے تلے جمع ہو جائیں تو پھر پوری دنیا اور اُس کی تمام قوتیں مل کر ان کا ایک بال بھی بیکا نہیں کر سکیں گی؛ بلکہ اس سے درحقیقت عالمی سیاست میں ایک انقلاب آجائے گا اور اُن کا ایک وزن قائم ہو جائے گا۔ ان کی حیثیت موجودہ متحدہ بلاکوں کے درمیان ایک بیلنسنگ پاور کی سی ہو جائے گی۔ یعنی وہ جس بلاک کی طرف ہو جائیں گے اُس کا پلڑا جھک جائے گا۔ یہ بھی گویا نمونہ ہوگا اُن کے "امّت وسط" ہونے کا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ :

اور اسی طرح ہم نے تم کو اُمت معتدل بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو۔ (البقرہ: ۱۴۳)

وَإِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ ۝ اور یہ تمہاری اُمت ایک ہی اُمت ہے اور میں تم سب کا رب ہوں۔ لہٰذا تم مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔
(مؤمنون: ۵۲)

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝ وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

اور تم سب مل کر اللہ کی رسّی (کتابِ الٰہی یا دینِ الٰہی) کو مضبوط پکڑے رہو اور متفرق مت ہو جاؤ۔ اور تم پر اللہ کی نعمت (اُس کے احسان) کو یاد کرو جب تم (باہم ایک دوسرے کے) دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی، جس کی وجہ سے تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ حالانکہ تم (اس وقت اپنی باہمی عداوت کی بنا پر) آگ کے گڑھے کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ پس اُس نے تمھیں اُس آگ سے بچا لیا۔ اِسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنے احکام بیان کرتا ہے، تاکہ تم راہ یاب ہو سکو۔

اور چاہیے کہ تم میں ایک ایسی جماعت ضرور (برپا) ہو جو (تمام) قوموں اور ملتوں کو خیر کی طرف بلائے اور (اُنھیں) معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے۔ اور یہی لوگ فلاح یاب ہوں گے۔

اور تم اُن لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جو تفریقِ باہمی اور اختلافِ باہمی کا شکار ہو گئے، باوجودیکہ اُن کے پاس واضح احکام پہنچ چکے تھے۔ ایسے لوگوں کے لیے بہت بڑا عذاب ہوگا۔
(آل عمران: ۱۰۳-۱۰۵)

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ اور اللہ اور اُس کے رسول کی (ہر حال میں) فرمانبرداری کرو۔ اور آپس میں جھگڑا مت کرو ورنہ تم پست ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔ اور اپنے دین و ایمان پر ہر حال میں) ثابت قدم رہو۔ بلاشبہ اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے۔ (الانفال: ۴۶)

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ۝

اور اگر تم نے روگردانی کی تو ہم تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لائیں گے۔ پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔ (محمد: ۳۸)

ان آیاتِ کریمہ میں ملّتِ اسلامیہ کو جو احکام و ہدایات دیے گئے ہیں وہ سب اجتماعی نوعیت کے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ہر حکم ملّی، اجتماعی اور تمدّنی نقطۂ نظر سے ایک زرّیں اصول وضابطے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اختلاف و افتراق کی حیثیت سے اس وقت دنیائے اسلام کی جو حالت و کیفیت ہے وہ دورِ رسالت کے عالمِ عرب سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، جس کا نقشہ سورۂ آلِ عمران کی مذکورہ بالا آیات میں کھینچا گیا ہے۔ مگر محض وحدتِ کلمہ اور وحدتِ دین وملت نے وہ حیرت انگیز کرشمہ انجام دیا جو اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب ہونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہی تاریخ آج بھی دُہرائی جا سکتی ہے بشرطیکہ ہم دینِ الٰہی کو اس کا صحیح مقام دینے کی کوشش کریں۔ ورنہ خود غرضی اور خواہشاتِ نفس کے ذریعہ کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہو سکے گا۔ لہٰذا اتحادِ ملت کے لیے سب سے پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ ہم اپنے ذاتی اغراض و مقاصد اور ہر قسم کے قومی، وطنی اور لسانی تعصبات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے صدائے ربانی پر کان دھریں اور اللہ کے سچے بندے بننے کی کوشش کریں۔ اس میں نہ صرف اپنی بقا کا سامان ہے بلکہ اسلام، دنیائے اسلام اور ایک ارب پیروانِ اسلام کی بقا کا سامان بھی ہے۔ هٰذا بصائر للناس۔

خلافتِ ارض اور جہاد فی سبیل اللہ:

اوپر کے مباحث سے واضح ہو گیا کہ جب تک دینی و اسلامی بنیادوں پر عالم اسلام کو متحد کر کے ایک مضبوط اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار قائم نہیں کی جائے گی ہمارے اجتماعی مسائل حل نہیں ہو سکتے اور مادی حیثیت سے قوت و شوکت حاصل نہیں ہو سکتی، اور ہمارے ملک و ملت کا دفاع مکمل نہیں ہو سکتا۔ نیز اس کے علاوہ اسلام کی مؤثر انداز میں تبلیغ، عالم انسانی کے درمیان صحیح معنی میں محاکمہ، سیاسی و بین الاقوامی تنازعات کی روک تھام، روئے زمین پر ہر قسم کے ظلم و زیادتی کا استیصال اور عدل و انصاف کا قیام وغیرہ اغراض و مقاصد کی تکمیل بھی مادی قوت و شوکت کے حصول پر موقوف ہے۔ اور یہ تمام اغراض و مقاصد "خلافتِ ارض" ہی کی بنیادی غرض و غایت کو ظاہر کر رہے ہیں۔

کارِ خلافت کیا ہے؟ اس پر حسب ذیل آیت کریمہ بخوبی روشنی ڈال رہی ہے، چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کو ــــ جو پیغمبر ہونے کے ساتھ ساتھ بادشاہ بھی تھے اور اسی اعتبار سے مادی قوت و شوکت سے بھی آراستہ تھے ــــ مخاطب کر کے خصوصیت کے ساتھ کہا گیا۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ:

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے لہٰذا تم لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کیا کرو۔ (ص: ۲۶)

اس لحاظ سے خلیفہ ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ اس دھرتی پر عدل و انصاف قائم کیا جائے اور ظلم و زیادتی کو مٹایا جائے۔ اور یہ معلوم ہے کہ کوئی کمزور شخص یا کمزور قوم زمین پر عدل و انصاف قائم نہیں کر سکتی۔ عدل و انصاف کے قیام کے لیے بھی قوت و طاقت کی ضرورت پڑتی ہے، تاکہ کمزوروں کو ظالموں سے اُن کا حق چھین کر دلایا جاسکے اور دنیا میں امن و امان

حال کیا جاسکے۔ یہ اصول نہ صرف معاشرتی اور اجتماعی لحاظ سے صحیح ہے بلکہ بین الملکتی اور بین الاقوامی حیثیت سے بھی صحیح ہے۔ کیونکہ "ظالم" انسان اور ناحق کوش قوم صرف "طاقت" کے آگے ہی سر جھکا سکتی ہے۔ اخلاق و وعظ و نصیحت اس کے لیے کارگر نہیں ہوتی۔ جیساکہ آج ہمارا روز مرہ کا مشاہدہ ہے کہ محض ذرا ذرا سی بات پر "لا اینڈ آرڈر" کا مسئلہ پیدا ہوجاتا ہے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۱۱۴ــ ۱۱۷۶ھ) تحریر فرماتے ہیں: "انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک عظیم مقصد لوگوں کے درمیان مظالم کی روک تھام کرنا بھی ہے۔ کیونکہ ان کی باہمی ظلم و زیادتی ان کے حال کو بگاڑ دیتی ہے اور ان پر زندگی تنگ کردیتی ہے۔"[1]

ان تمام مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے امت مسلمہ کو جہاد کا حکم دیا گیا ہے، جن میں سب سے زیادہ مقدم دین و ملت کی حفاظت اور ان کا دفاع ہے۔ جہاد کوئی وقتی و عارضی فریضہ نہیں بلکہ قیامت تک جاری رہنے والا ایک مستقل فریضہ ہے جو عمومی حالات میں فرض کفایہ اور خصوصی حالات میں فرض عین بن جاتا ہے۔ (تفصیل آگے آرہی ہے۔) اسی بنا پر خلافت ارض کا جہاد کے ساتھ بہت گہرا ربط و تعلق ہے۔ لہٰذا خلافتِ ارض اور جہاد کے صحیح تعلق اور اس کے فلسفے کو سمجھنے کے لیے شریعت میں جہاد کے موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے اُس کا اس موقع پر خلاصہ بیان کیا جاتا ہے۔

علامہ کاسانیؒ (متوفی ۵۸۷ھ) "بدائع الصنائع" میں لفظ جہاد کی تعریف کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "جہاد کے لغوی معنی طاقت لگانے یا کسی کام میں انتہائی جد و جہد کرنے کے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں اس سے مراد (اسلام کی مدافعت کے لیے) اللہ کی راہ میں اپنی وسعت و طاقت کے مطابق نفس، مال اور زبان کے ذریعے جنگ کرنا یا اس میں

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ، بحث فی المظالم، ۲/۱۵۱، رشیدیہ دہلی، ۱۳۵۵ھ۔

مبالغہ کرتا ہے۔[1]

قاضی ابن رشد مالکی اندلسیؒ (۵۲۰ - ۵۹۵ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ حسب ذیل آیت کریمہ کی رُو سے جمہور علماء کے نزدیک جہاد فرض ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ[2] قتال (جنگ) تم پر فرض کی گئی ہے، حالانکہ وہ (طبعًا) تمہارے لیے گراں ہے (بقرہ: ۲۱۶)

فرضیتِ جہاد کے بارے میں دیگر آیتیں یہ ہیں:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝ اور تم اللہ کے راستے میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ مگر (اس معاملے میں) زیادتی نہ کرو۔ کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔[3]

---

[1] بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ۷/۹۷، مطبوعہ کراچی، ۱۴۰۰ھ۔

[2] بدایۃ المجتہد، ابن رشد، ۱/۳۲۵، مصر، ۱۳۳۹ھ

[3] علامہ جصاص رازیؒ اس آیت کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ بقول ربیع بن انس یہ پہلی آیت ہے جو ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں جہاد کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کے بعد رسول اللہ صلعم کا یہ معمول رہا کہ آپ صرف ان مشرکین سے مقاتلہ فرماتے جو آپؐ سے برسرپیکار ہوتے اور اس سے تجاوز فرماتے جو آپؐ کے درپے نہ ہوتا، یہاں تک کہ (جزیرۃ العرب کے) تمام مشرکین سے (اُن کی مسلسل سرکشی اور ایذا رسانی کی وجہ سے) قتال کا حکم آگیا۔ (احکام القرآن: ۱/۲۵۷)

ایک قول یہ بھی ہے کہ ہجرت کے بعد جہاد کی پہلی آیت جو نازل ہوئی وہ یہ ہے: "أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا" (اُن لوگوں کو اجازت دے دی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے، اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا۔) یہ اور دیگر آیاتِ جہاد اس بات کی بجا طور نشاندہی کر رہی ہیں کہ جہاد کوئی جارحانہ فعل یا مسلمانوں کی طرف سے زیادتی کے طور پر نہیں تھا بلکہ وہ مدافعانہ اور تا حد دفاعی تھا، جیسا کہ تاریخی طور پر ثابت ہوتا ہے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ط اور تم اُن سے یہاں تک لڑو کہ فتنہ (فسادِ عقیدہ) باقی نہ رہے اور دین اللہ ہی کا ہو جائے۔ (البقرہ: ۱۹۳)

فرضیتِ جہاد کی دوامیت پر ایک حدیث میں اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے:

والجهاد ماض منذ بعثني الله الى أن يقاتل آخر أمتي الدجال، لا يبطله جور جائر ولا عدل عادل: جہاد جب سے کہ اللہ تعالیٰ نے میری بعثت فرمائی ہے اُس وقت سے لے کر جب تک کہ میری اُمت کا آخری فرد دجال سے قتال نہ کرے برابر (ہر دور میں) جاری رہے گا۔ جس کو نہ تو کسی زیادتی کرنے والے (امیر) کی زیادتی باطل کر سکے گی اور نہ کسی عادل کی عدل گستری[1] (یعنی وہ ہر حال میں فرض رہے گا اور کسی صورت میں اور کسی حیلے سے ساقط نہ ہو سکے گا۔)

ایک دوسری حدیث میں مذکور ہے:

الخيل معقود في نواصيها الخير الى يوم القيمة الأجر والمغنم: خیر قیامت تک گھوڑوں کی پیشانیوں سے بندھا ہوا ہے، یعنی اجر اور مال غنیمت (کے اعتبار سے)[2]

حافظ ابن حجرؒ (۷۷۲ — ۸۵۲ھ) اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ یہاں پر "خیر" سے مراد جہاد کا اجر و ثواب اور مال غنیمت ہے جو گھوڑوں سے جہاد کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے، خواہ امام عادل ہو یا ظالم۔ اس حدیث میں جہاد کی ترغیب ہے اور قیامت تک اسلام اور اہل اسلام کے لیے بشارت بھی موجود ہے۔ کیونکہ بقائے جہاد کے لزوم سے مجاہدین کی بقا کا ساماں[3]

---

[1] ابو داؤد، کتاب الجہاد، ۳/۴۰، مطبوعہ حمص (شوریہ) ۱۹۷۱ء۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، ۳/۲۱۶، مطبوعہ استانبول، ۱۹۷۹ء۔ اس موقع پر گھوڑوں کے لفظ کو استعمال کیے جانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے مراد قیامت تک گھوڑے ہی رہیں گے، بلکہ جو بھی ذریعہ یا وسیلہ استعمال کیا جائے۔ اصل میں یہاں پر جہاد کی روح کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔

ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں مذکور ہے:

لا تزال طائفة من أمتي يقاتلون على الحق[1]: میری امت کا ایک طبقہ ہمیشہ حق کی مدافعت میں لڑتا رہے گا۔

جہاد کی تعریف اور اُس کے مقاصد کے مطالعے سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ جہاد نام ہی اس بات کا ہے کہ دشمنانِ اسلام کو اپنے ملکوں میں در آنے سے روکا جائے اور اپنے دین و ملت کا بجدّ استطاعت دفاع کیا جائے۔ مگر غیر مسلموں میں اس کا مفہوم محض "جنگ" سمجھا جاتا ہے جو ان کی اپنی غلط فہمی ہے۔ اور مخالفینِ اسلام خصوصاً مستشرقین نے اس نظریہ کو خوب اچھالا، گویا کہ اسلام بھی ایک "خونی" مذہب ہے اور اس کو "خون آشامی" کی چاٹ پڑ گئی ہے۔ مگر اوپر جو آیتیں نقل کی گئی ہیں وہ سب اس قسم کے مہمل نظریات کی تردید کر رہی ہیں۔

مکی دور میں مسلمان کس پرسی کے عالم میں تھے۔ اس لیے اُس وقت جہاد فرض نہیں تھا۔ مگر جب مدنی دور میں انھیں قوت و طاقت حاصل ہو گئی اور اسلام جغرافیائی اعتبار سے ایک قطعۂ ارض کا مالک بن گیا تو اُس وقت اسلامی سلطنت کو ہر قیمت پر بچانا اور دشمنوں کی حرص و آز سے اس کو محفوظ رکھنا ضروری ہو گیا، تاکہ اسلام اپنی باطنی خوبیوں اور اخلاقی محاسن کی بنا پر قدرتی طور پر نشو و نما پاتا رہے اور اس راہ میں سدّ راہ اور مزاحم بننے والی ہر طاغوتی قوت و طاقت کا مقابلہ کیا جا سکے اور پوری قوت کے ساتھ ایسی تمام کوششوں کو ناکام بنایا جا سکے لہٰذا ایسے نازک موقع پر اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور انھیں اپنے دین و ملت کی مدافعت کرنے اور برابر کا بدلہ لینے کی تاکید کی گئی تاکہ بین الاقوامی اعتبار سے فتنوں کا سدّ باب ہو جائے مگر یہ اخلاقی اصول بھی بیان کر دیا گیا کہ کسی قوم کے خلاف ظلم و زیادتی نہ کی جائے۔

---

[1] فتح الباری، ۶/۳۶، مطبوعہ مصر۔

جیساکہ حسب ذیل آیات سے اس مسئلے پر تفصیلی روشنی پڑتی ہے:

وَالَّذِيْنَ إِذَآ أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ اور جب اُن پر زیادتی کی جاتی ہے تو وہ برابر کا بدلہ لیتے ہیں۔ (شوریٰ: ۳۹)

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ص وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا أَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ جو تم پر زیادتی کرے، تم بھی اُس پر زیادتی کرو جیسی کہ اس نے تم پر کی ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور یقین مانو کہ اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (بقرہ: ۱۹۴)۔

یہ اسلام کا وہ بیش بہا اصول جنگ ہے جو دنیا کی دیگر قوموں اور ان کے ظالمانہ قوانین کے مقابلے میں ایک مثالی اہمیت و نوعیت کا مالک ہے۔ جیساکہ تاریخ عالم شاہد ہے غیر اسلامی قوموں کے پاس جنگ کے موقع پر اخلاقیات کا کوئی خانہ ہی نہیں تھا۔ اور یہی حال موجودہ دور کا بھی ہے۔ اسلامی اور غیر اسلامی جنگوں میں اصل فرق بنیادی مقصد اور آئیڈیالوجی کا ہے۔ مسلم قوم جب جنگ کرتی ہے تو اس کے سامنے دین کی سربلندی اور اعلائے کلمۃ اللہ مقصد ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ احکام الٰہی کا ہر حال میں پابند رہتا ہے۔ اور دیگر قوموں پر بے جا ظلم و زیادتی کو وہ نہ صرف ایک اخلاقی گناہ سمجھتا ہے بلکہ وہ اس کو خدا کی نافرمانی بھی تصور کرتا ہے۔ اس کے برعکس دیگر قوموں کے پاس اس قسم کا کوئی اعلیٰ و ارفع تصور ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ محض اپنی شان و شوکت اور قومی و نسلی تفاخر کے اظہار کے طور پر تلوار اٹھاتی ہیں۔ اس بنیادی فرق کی وضاحت قرآن حکیم میں اس طرح کی گئی ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ج وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا أَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ج إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں اور جو منکر خدا ہیں وہ طاغوت[1]

---

[1] طاغوت کے اصلی معنی حد سے تجاوز کرنے والے کے ہیں۔ اور اسی مناسبت سے ساحر، کاہن اور سرکش جن
(باقی ص ۲۱ پر)

کی راہ میں لڑتے ہیں۔ لہٰذا تم شیطان کے (ایسے) ساتھیوں سے لڑو (اور جان رکھو کہ) شیطان کی تدبیر بلاشبہ کمزور ہوتی ہے[۱]۔ (نساء: ۷۶)

اس اصول کی وضاحت احادیث میں اس طرح کی گئی ہے:

"ایک شخص نے رسول اکرم صلعم سے دریافت کیا: بتائیے ایک شخص مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے لڑتا ہے، دوسرا شخص نام و نمود کے لیے لڑتا ہے، اور کوئی شخص اپنے مرتبے کو بلند کرنے کے لیے لڑتا ہے، تو ان میں سے کون اللہ کی راہ میں ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ صرف وہ شخص اللہ کی راہ میں ہوگا جس نے اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے جنگ کی ہو[۲]۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲) کو بھی طاغوت کہا جاتا ہے: "اس سے مراد ہے حد سے آگے بڑھ جانے والا اور ہر وہ معبود جو خدا کے سوا ہو۔" (المفردات، ص ۳۰۵) معبود بنا لینے کا مفہوم موجودہ اصطلاح کے مطابق کوئی ایسا نظریۂ حیات ہو سکتا ہے جو خدا کا باغی یا خدا بیزار قسم کا ہو۔ جیسے کمیونزم اور نیشنلزم وغیرہ۔

[۱] دشمن کے مقابلے کے لیے نفسیاتی اعتبار سے سپاہیوں کے حوصلوں کو بلند رکھنے کے لیے جدید فلسفۂ جنگ کے مطابق مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہیں اور اس بات کی سرتوڑ کوشش کی جاتی ہے کہ اپنی فوج دشمن کے مقابلے میں حوصلہ نہ ہارے۔ کیونکہ یاس اور ناامیدی ہمیشہ شکست کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے جو لشکر یا جماعت حوصلہ ہار دے وہ میدان میں ٹھہر ہی نہیں سکتی، اس کا کامیاب و کامران ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔ اس نکتے کو قرآن نے چودہ سو سال پہلے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے جیسا کہ ایک دوسرے موقع پر اس حقیقت پر بھی روشنی ڈال دی کہ جہاد کی صورت میں دو ہی نتیجے برآمد ہو سکتے ہیں: یا تو فتح و کامرانی حاصل ہوگی یا پھر جام شہادت نوشی کرنے کے باعث حیات جاودانی۔ ان دونوں ہی صورتوں میں گویا کہ گوہر مقصود حاصل رہے گا:

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ط کہہ دو کہ تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں میں سے کسی ایک ہی کے منتظر رہتے ہو۔ (توبہ: ۵۲)

[۲] صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، ۳/۲۰۶، مطبوعہ استانبول۔

"اللہ تعالیٰ کے کلمے کو بلند کرنا" (اعلائے کلمۃ اللہ) ایک وسیع اصطلاح ہے، جس میں پوری شریعت اسلامیہ کا نفاذ داخل ہے۔ اس اعتبار سے اس میں تمام اخلاقی مفاسد کی روک تھام اور ہر قسم کے ظلم و عدوان کا استیصال بھی شامل ہے۔ تاکہ یہ دھرتی صحیح معنی میں امن و سلامتی کا گہوارہ بن جائے اور پوری مخلوق الٰہی (الخلق عیال اللہ کے مطابق) ایک وسیع کنبے کی شکل میں چین و سکون کا سانس لے اور کسی کو بھی مراسم عبودیت کی ادائیگی میں کوئی رکاوٹ محسوس نہ ہو۔ یہ جہاد کا صحیح فلسفہ اور اس کی اصل روح ہے، جیسا کہ حسب ذیل آیت کریمہ سے مستفاد ہوتا ہے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ ط اور ان سے یہاں تک لڑو کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ ہی کا ہو جائے۔ (انفال: ۳۹)

لفظ فتنہ سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں امام راغب اصفہانیؒ (متوفی ۵۰۲ھ) نے بہت بہترین تحقیق کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"فتنے کی اصل سونے کو آگ میں تپانا ہے تاکہ اس کا کھوٹ زائل ہو اور اس کی چمک دمک ظاہر ہو جائے۔ اور اس طرح یہ انسان کو آگ میں داخل کرنے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے: (يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُونَ)[1] اس اعتبار سے اس کے دو محمل ہیں: کبھی تو اس سے عذاب مراد ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: (أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا)[2] اور کبھی اس سے آزمائش مراد ہوتی ہے۔ جیسے: (وَفَتَنَّاكَ فُتُونًا)[3] اور لفظ فتنہ "بلاء" کی طرح شدت اور آسائش دونوں حالتوں کے لیے استعمال

---

[1] ترجمہ: جس دن کہ وہ آگ پر رکھے جائیں گے۔ (ذاریات: ۱۳)

[2] خوب سمجھ لو کہ یہ (منافقین) خرابی میں پڑ چکے ہیں۔ (یعنی نتیجے کے اعتبار سے) (توبہ: ۴۹)

[3] (اے موسیٰ) ہم نے تجھ خوب آزمایا۔ (طٰہٰ: ۴۰)

کیا جاتا ہے۔ مگر یہ شدت کے معنی میں زیادہ ظاہر اور بکثرت مستعمل ہے۔ ان دونوں حالتوں کے بارے میں ارشاد ہے: (وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً)[1] چنانچہ شدت و سختی کے بارے میں ارشاد ہے: (إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ)[2] نیز: (وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ)[3] نیز: (وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ)[4]

لفظ فتنہ ان افعال میں سے ہے جن کا صدور اللہ کی طرف سے بھی ہوتا ہے اور بندے کی طرف سے بھی۔ جیسے بلاء، مصیبت، قتل اور عذاب وغیرہ ناپسندیدہ افعال۔ مگر یہ افعال جب اللہ کی جانب سے ہوں تو وہ بتقاضائے حکمت ہوں گے لیکن اگر ان کا صدور انسان کی جانب سے اور بغیر حکم الٰہی ہو تو پھر وہ اس کے خلاف ہوں گے۔ اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ طرح طرح کے فتنوں کی وجہ سے انسان کی مذمت کی ہے: (وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ)[5] نیز: (إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ)[6]۔

---

[1] اور ہم تم کو اچھی اور بُری دونوں حالتوں میں بطور امتحان آزماتے ہیں۔ (انبیاء: ۳۵)

[2] ہم تو ذریعۂ آزمائش ہیں۔ (بقرہ: ۱۰۲)

[3] اور فتنہ جو ئی قتل سے بھی سخت ہے۔ (بقرہ: ۱۹۰)

[4] ان کفار و مشرکین سے جہاد کرو یہاں تک کہ فتنہ و فساد باقی نہ رہے۔ (بقرہ: ۱۹۳)

[5] اور فتنہ جو ئی قتل سے بھی سخت ہے۔ (بقرہ: ۱۹۰)

[6] جن لوگوں نے اہل ایمان کو فتنے میں مبتلا کیا۔ (بروج: ۱۰)

(ملخص از المفردات فی غریب القرآن، ص ۳۷۱-۳۷۲، بیروت)

عام تفسیروں میں زیر بحث آیت کریمہ میں فتنے سے مراد خاص کر شرک و کفر بتایا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر، تفسیر کشاف اور احکام القرآن از جصاص وغیرہ) یہ اصل میں دور نزول کے حالات و واقعات کے انطباق کی وجہ سے تھا۔ جب اس کے الفاظ عام ہیں تو پھر اس کو عام ہی رکھنا چاہیے تاکہ وہ ہر دور کی آزمائشوں کا مصداق بن سکیں۔

بہر حال اسی بنیادی غرض و غایت کی بنا پر جہاد فرض کیا گیا ہے۔ اور تمام علمائے اسلام اس پر متفق ہیں کہ جہاد اُمت مسلمہ پر فرض ہے۔ مگر بقول حافظ ابن حجرؒ مذہب شافعی میں اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا یہ جہاد فرض عین ہے یا فرض کفایہ ؟ یعنی آیا یہ فریضہ ہر ہر شخص کے ذمے ہر حال میں ضروری ہے یا بعض افراد اگر اس فریضے کو ادا کر دیں تو بقیہ افراد کے ذمے سے ساقط ہو جا۔ نہ گا بہ فرماتے ہیں :

"تحقیقی بات یہ ہے کہ یہ رسول اللہ صلعم کے دور میں اُن لوگوں پر فرض عین تھا جن کو رسول اللہ صلعم نے اس کام پر مامور فرما دیا تھا مگر آپ کی وفات کے بعد یہ مشہور قول کے مطابق فرض کفایہ ہے، الا یہ کہ کوئی (ہنگامی) ضرورت پیش آجائے اور دشمن اچانک آپڑے۔ تو اس وقت امام وقت جس کو (اس کام کے لیے) متعین کر دے اُس کے ذمے یہ (فرض) عین بن جائے گا۔" لہ

احناف کے نزدیک جہاد اُس وقت تک فرض کفایہ ہے جب تک کہ "نفیر عام" (یا ہنگامی حالات کا اعلان) نہ ہو جائے۔ جب نفیر عام ہو جائے تو پھر یہ (اُن تمام افراد پر جو اس کے اہل ہوں) فرض عین بن جائے گا۔ جیسا کہ حسب ذیل آیت سے ثابت ہوتا ہے :

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ؀ نکل پڑو ہلکے یا بھاری ہو کر (تھوڑے یا زیادہ سامانِ اسلحہ کے ساتھ۔) اور جہاد کرو اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ سکو۔ (توبہ : ۴۱)

اور جہاد کے عمومی حالات میں فرض کفایہ ہونے کی دلیل یہ دی جاتی ہے :

لہ فتح الباری، ۶/۲۴، مطبوعہ مصر۔

کہ ہدایہ اولین، ص ۵۳۸ - ۵۳۹، مجتبائی دہلی۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ[1] اور ایسا نہیں ہوسکتا کہ تمام اہل ایمان (جہاد کے لیے) نکل کھڑے ہوجائیں اس لیے اُن کے ہر ہر فرقے میں سے ایک (خاص) جماعت کیوں نہیں نکلی تاکہ وہ دین کی سمجھ (علم کے ذریعہ دین میں رسوخ) حاصل کرے۔ اور جب وہ (رسوخ فی الدین حاصل کرکے) لوٹیں تو اپنی قوم کو متنبہ کرسکیں۔ تاکہ وہ (پورے دین پر عامل ہوکر عذاب الٰہی سے) بچ سکیں۔ (توبہ: ۱۲۲)

اس آیت کریمہ کے مطابق اہل ایمان کی دو جماعتیں ہونی چاہئیں۔ ایک جماعت جہاد میں مصروف رہ کر ملک و ملت کا دفاع کرتی رہے اور دوسری علم دین حاصل کرکے پوری قوم و ملت کی دینی اعتبار سے قیادت کرے اور اس کو خصوصیت کے ساتھ "ایام اللہ" سے آگاہ اور متنبہ کرتی رہے[2]

علامہ ابن قیم رح (۶۹۱ - ۷۵۱ھ) نے اس سلسلے میں بڑی فکر انگیز بات تحریر فرمائی ہے:

"اور تحقیق یہ ہے کہ جنس جہاد فرض عین ہے خواہ وہ قلب کے ذریعہ ہو یا لسان کے ذریعہ یا مال کے ذریعہ یا ہاتھ کے ذریعہ۔ لہٰذا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان اقسام میں سے کسی ایک کے ساتھ جہاد کرے۔ اب رہا معاملہ جہاد بالنفس کا تو یہ فرض کفایہ ہے"[3]

---

[1] بدایۃ المجتہد، قاضی ابن رشد، ۱/۳۲۵، مطبوعہ مصر۔

[2] ایام اللہ سے مراد گزشتہ قوموں کے وہ سبق آموز حالات و واقعات ہیں جو مخاطبین کی تذکیر کے لیے خاطر قرآن میں مذکور ہیں۔ اسی کو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے "التذکیر بایام اللہ" کا نام دیا ہے، جو قرآن کے علوم خمسہ میں سے ایک مستقل علم ہے۔ (الفوز الکبیر) اور اس موضوع پر سیکڑوں ہزاروں آیتیں بکھری ہوئی ہیں۔

[3] زاد المعاد فی ھدی خیر العباد، ۲/۵۸، دارالافتاء، ریاض۔

ایک دوسرے موقع پر علامہ موصوف نے مراتب جہاد کی چار قسمیں بیان کی ہیں جو یہ ہیں: (۱) نفس کے ساتھ جہاد (۲) شیطان کے ساتھ جہاد (۳) کفار کے ساتھ جہاد۔ (۴) اور منافقین کے ساتھ جہاد[1] پھر ان میں سے ہر ایک کی متعدد شکلیں بیان کی ہیں، جن کی تفصیل یہاں پر غیر ضروری ہے۔ مگر جہاد کے فلسفے پر آغاز بحث میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا خلاصہ اس موقع پر درج کرنے کے قابل ہے:

"چونکہ جہاد اسلام کی اونچی چوٹی ہے اور جنت میں مجاہدین کی منزلیں سب سے اعلیٰ ہوں گی۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کے سب سے اعلیٰ مرتبے پر فائز تھے، اور آپؐ نے جہاد کی تمام قسموں ــــ قلبی جہاد، دعوتی جہاد اور تلوار کے ذریعہ جہاد ــــ کو ادا فرمایا۔ آپؐ کے تمام اوقات (پوری زندگی) اس کام کے لیے وقف تھے۔ اور اسی بنا پر آپؐ کا مرتبہ اللہ کے نزدیک سب سے اونچا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی بعثت کے ساتھ ہی آپؐ کو جہاد کا حکم دے دیا تھا:

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيرًا ۝ فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا ۝ اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک تنبیہ کرنے والا بھیج دیتے۔ (مگر ہم نے ایسا کرنے کی بجائے ایک جامع کتاب اُتار دی جو سب کے لیے کافی ہو جائے۔) لہٰذا تم منکرین کے کہے میں مت آؤ اور اس (قرآن) کے ذریعہ زور و شور سے ان کا مقابلہ کرو۔ (فرقان: ۵۱-۵۲)

یہ مکی سورت ہے جس میں حجت و بیان اور تبلیغ قرآن کے ذریعہ کفار سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ اور چونکہ افضل ترین جہاد شدید رکاوٹوں کے باوجود حق بات کہنا ہے، جو انبیاء علیہم السلام ہی کا کام اور ان کا دل گردہ تھا، مثلاً ایسے آدمی کے سامنے بات کرنا جس کی ہیبت چھائی ہوئی ہو یا جس سے ایذا رسانی کا خوف ہو، اس لیے ہمارے نبی کریم صلعم کا اس باب میں کامل

---

[1] ایضاً۔ ۲/۳۹

اور مکمل جہاد کا نمونہ موجود ہے[1]

ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے میں شدید خواہش رکھتا ہوں اس بات کی کہ میں راہ الٰہی میں مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں اور مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں اور مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں اور مارا جاؤں[2]

اس سے جہاں ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف جہاد کی فضیلت اور اُس کی اہمیت بھی صاف ظاہر ہوتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جہاد ملت اسلامیہ کے لیے سراپا زندگی اور سراپا حیات ہے۔ جب کہ ترک جہاد اس کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ آج عالم اسلام میں جتنے بھی مفاسد اور رخنے پیدا ہو گئے ہیں وہ سب ترک جہاد اور روح جہاد سے اعراض و روگردانی اور لاپرواہی کا نتیجہ ہیں۔ جہاد سے منہ موڑنے کا نتیجہ سوائے تباہی و بربادی اور دوسروں کی غلامی و ذلت کے اور کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

اِلَّا تَنۡفِرُوۡا يُعَذِّبۡكُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ۙ وَّيَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ وَلَا تَضُرُّوۡهُ شَيۡـًٔا ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۝ اگر تم (جہاد کے لیے) نہ نکلو گے تو اللہ تم کو دردناک (دنیوی) عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ (وہ اس طرح کہ) وہ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا (جو یا تو تم پر مسلّط ہو جائے گی یا تم کو کاٹ کر پھینک دے گی) اور تم اُس کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکو گے اور اللہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے۔ (توبہ: ۳۹)

ایک دوسرے موقع پر فرمایا گیا کہ اسلام دشمن قوتیں ہمیشہ اہل اسلام سے برسرپیکار رہتی ہیں۔

له ایضاً ۲/۳۸۔

ٹه صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، ۳/۲۰۳، استانبول، ۱۹۷۹ء۔

اور ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ موقع ملتے ہی تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں، لہٰذا ایسے چالاک دشمنوں سے ہمیشہ چوکنا رہنا چاہیے جو مسلسل گھات میں رہتے ہیں۔ (جیسا کہ آج دنیا کے بہت سے اسلامی ملکوں کو اغیار نے اپنے نرغے میں لے رکھا ہے۔) یہ بھی ایک صداقت ہے کلام ربانی کی کہ اس کی پیش خبریاں ہر دور میں برابر پوری ہوتی رہی ہیں۔

وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا اور یہ (منکرین حق) تم سے ہمیشہ لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ تمہیں تمہارے دین سے برگشتہ کر دیں اگر وہ (تم پر) قابو پا جائیں۔ (بقرہ: ۲۱۷)

جغرافیائی اعتبار سے مختلف خطہ ہائے ارض میں بسنے والے دینی بھائی جب کسی اعتبار سے مشکل حالات سے دوچار ہو جائیں اور وہ ایک دوسرے کی مدد کے طالب ہوں تو پھر اسلامی نقطۂ نظر سے ان کی مدد کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اور ایسے مواقع پر اپنے کلمہ گو بھائیوں کی مدد نہ کرنے کو بہت بڑا فتنہ و فساد کہا گیا ہے:

إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بہت بڑا فساد ہو جائے گا۔ (انفال: ۷۳)

ایک دوسرے موقع پر بطور ایک عمومی اصول بیان کیا گیا ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ: اور اگر اللہ (اپنی سنت جاریہ کے مطابق) انسانی (گروہوں میں سے) ایک دوسرے کی مدافعت نہ کرتا تو زمین فساد سے بھر جاتی۔ (بقرہ: ۲۵۱)

یہی وجہ ہے کہ جہاد ہر حال میں فرض قرار دیا گیا ہے اور اس کی اس قدر شدید تاکید کی گئی ہے۔ جہاد کی اہمیت و فضیلت اور اس کی حکمتوں اور مصلحتوں سے قرآن و حدیث کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔ ایک موقع پر بڑی صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ جہاد سے منہ موڑنا منافقین کی علامت اور جہاد کی خاطر اپنا مال و متاع اور اپنی جانیں وغیرہ سب کچھ لٹا دینا

ایمان والوں کی صفت ہے۔

وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ۝ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝ لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۔

اور جب (اس مضمون کی) کوئی سورت نازل کی جاتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ہمراہ جہاد کرو تو (ایسے موقع پر) مالدار لوگ تجھ سے رخصت مانگنے لگ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو بیٹھنے والوں (جنگ میں کسی معذوری کی بنا پر شرکت نہ کرنے والوں) کے ساتھ رہنے دیجیے۔ وہ خانہ نشین عورتوں کے ساتھ رہنے پر راضی ہو گئے (اور اس طرح) ان کے دلوں پر مہر لگ گئی۔ اس لیے وہ (قانون خداوندی کو) نہیں سمجھتے۔ لیکن رسول اور اس کے ساتھ جو ایمان والے لوگ ہیں انھوں نے اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کیا۔ انھیں کے لیے ہیں تمام بھلائیاں۔ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ (توبہ: ۸۶-۸۸)

جہاد کی اسی اہمیت کے پیش نظر یہاں پر ایمان باللہ کے فوراً بعد جہاد کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ گویا کہ ایمان باللہ کا تقاضہ ہے کہ جہاد کیا جائے۔ بالفاظ دیگر جب ایمان باللہ خطرے میں پڑ جائے یا اہل ایمان پر عرصۂ حیات تنگ ہو جائے تو اس موقع پر جہاد ضروری ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دوسرے موقع پر جہاد کو ایمان و یقین کی نشانی قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ وہ کسی بھی شخص یا کسی بھی قوم کے دعوائے صدق و سچائی کا معیار ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ پورے مومن وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر، پھر انھوں نے (کسی بھی معاملے میں) شک نہیں کیا۔

اور اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرتے رہے۔ یہی لوگ سچے ہیں۔ (حجرات ۱۵:۴۹)

جہاد کی اس قدر اہمیت و منزلت کیوں ہے؟ اس سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہ نے بڑی حکیمانہ بات تحریر فرمائی ہے:

"جان لو کہ شریعتوں میں سب سے زیادہ مکمل شریعت وہی ہو سکتی ہے جس میں جہاد کا حکم دیا گیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو امر و نہی کا مکلف ٹھہرانا ایسے ہی ہے جیسے کسی صاحب کے نوکر چاکر بیمار ہو گئے ہوں اور وہ اپنے کسی خاص آدمی سے کہے کہ وہ ان بیماروں کو دوا پلادے۔ لہٰذا اگر وہ شخص اُن کو زبردستی دوا پلائے تو اس کو اس کا حق حاصل رہے گا لیکن شفقت کا تقاضہ ہے کہ وہ ان کے سامنے دوا کے فوائد بیان کردے تاکہ وہ اس کو برضا و رغبت پی سکیں اور یہ بھی بہتر ہے کہ وہ اس دوا میں تھوڑی سی شہد ملا دے تاکہ اس میں طبعی و عقلی دونوں رغبتیں باہم مل جائیں۔

نوع انسانی کے تعلق سے (اللہ تعالیٰ کی) رحمت کاملہ کا تقاضہ ہے کہ وہ اس کو حسن عمل کی طرف لے جائے، ظالم کو اس کے ظلم سے روکے اور انسان کے تمام عائلی و اجتماعی معاملات کو درست کرے۔ اس اعتبار سے وہ (تمام) شہر جو (تہذیبی و تمدنی اعتبار سے) فاسد ہو چکے ہوں اور جن پر درندہ صفت افراد غالب آ گئے ہوں اور نیز ان کو نہایت درجہ قوت حاصل ہو چکی ہو، وہ جسم انسانی کے ایک ناسور کی طرح ہیں جس کو کاٹ کر پھینکے بغیر انسانی جسم درست نہیں ہو سکتا۔ اور جب تھوڑی سی برائی سے بہت بڑا خیر حاصل ہو سکتا ہو تو یہ فعل واجب العمل ہوگا۔"[1]

پھر آگے فرماتے ہیں:

"جان لو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت خلافت عامہ کے ساتھ ہوئی ہے۔ دیگر ادیان پر آپ کے دین کا غلبہ صرف جہاد و اعداد آلات کی تیاری ہی کے ذریعہ برپا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اگر اہل اسلام جہاد کو ترک کرکے بیلوں کی دُموں کے پیچھے پڑ جائیں تو ان کو رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا اور دیگر اہل مذاہب ان

[1] حجۃ اللہ البالغہ، ملخص از مبحث فی الجہاد، ۲/۱۷۰، رشیدیہ دہلی۔ [2] ایضاً، ۲/۱۷۲۔